زندگی جب تک !

تبصرہ از سرکار زینی جارچوی

حیات اور ممات ایک ہی فطری عمل کے دو مختلف پہلو ہیں۔ یہ خود کار عمل پوری کائنات میں بصورتِ دائرہ جاری وساری ہے اور جو عمل دائرہ کی شکل میں جاری ہو، وہ کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتا، چنانچہ کائنات کا ایک ایک ذرہ ارتقائی عمل کی تکمیل کے لئے محوِ سفر ہے۔

جہاں تک جان دار اور بالخصوص انسان کا تعلق ہے تو اس کی حیات ہی سفر ہے۔ انسان کا حیاتی سفر شکمِ مادر سے شروع ہو کر موت کی منزلیں لیتے ہوئے مادرِ ارض کے بطن میں پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ انسان کی پوری زندگی ایک سفر ہے، حتیٰ کہ جب یہ آرام دہ بستر پر دراز ہو تب بھی تخیّل وتصوّر کی دنیا میں محوِ سفر رہتا ہے اور جب خوابِ غفلت میں پڑا ہو تب بھی عالمِ خواب کا سفر کر رہا ہوتا ہے۔ انسان کی پوری زندگی ایک سفر ہے، اس لئے ''سفر کب تک؟'' کا جواب 'زندگی جب تک!' ہی ہو سکتا ہے۔

اگرچہ انسان نے وجود میں آنے کے ساتھ ہی صحیح معنیٰ میں سفر کا آغاز اسی وقت کر دیا تھا جب وہ جنگلوں میں رہتا تھا، غذائی ضرورت اور موسمی تبدیلیوں کے سبب نقلِ مکانی پر مجبور تھا، نئے قدرتی مناظر اور فرحت انگیز سبزہ زاروں سے لطف اندوز ہوتا تھا...... زبان نے جو وجود حاصل کیا تو سفر کی لطف انگیزیوں اور قدرتی مناظر کے تاثرات کو دوسروں تک پہنچایا گیا، مقامات کے فوائد کا ذکر کیا گیا۔ یہیں سے کہانیوں کی

ابتداء ہوئی اور یہی کہانیاں افسانہ، ناول اور داستان میں تبدیل ہوکر ادب کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنیں۔ سفری جذبات واحساسات اور اثرات ہی ادب کی تخلیق کا سبب بنے اور انہی سفری مشاہدات نے تاریخ کو جنم دیا۔لیکن کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ اس عرصہ میں نہ تو کسی سفرنامہ نے وجود حاصل کیا، نہ اسے ادب میں کوئی جگہ ملی اور نہ ہی کسی سیاح نے سفری حالات ترتیب دے کر قلمبند کئے جو سفرنامہ کہے جائیں۔ بہت سے ممالک کی دریافت سفر ہی کے دوران ہوئی تھی۔ امریکہ کی دریافت سفر ہی کا نتیجہ ہے۔ ایسے سیاحوں میں مارکوپولو، ابنِ بطوطہ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ تاریخِ فرشتہ بھی مختلف مقامات کی سفری تاریخ ہے۔ اسی لئے دورِ حاضر میں سیاحت کو بلند مقام حاصل ہے۔

سیّاح دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو بیرونِ ملک سیاحت کو پسند کرتے ہیں اور ایک وہ جو اندرونِ ملک سیاحت کرتے ہیں۔ اندرونِ ملک کے سیّاح اپنے سفر کے حالات شاید اس لئے قلم بند نہیں کرتے کہ اکثر لوگ ایک سے دوسرے مقام آتے جاتے رہتے ہیں اور وہاں کے حالات بیان کرتے رہتے ہیں۔ اردو زبان میں شائع شدہ سفرناموں میں ایک نام سلطانہ ذاکر آدا کا ملتا ہے، جنہوں نے اندرون و بیرونِ ملک بیشتر مقامات کی سیاحت کی اور ایک طویل سفرنامہ مرتّب کیا جس کا نام "سفر کب تک؟" ہے۔ لیکن یہ اردو زبان میں پہلا سفرنامہ نہیں ہے، اس سے پہلے کئی پاکستانی خواتین نے سفرنامے مرتّب کئے ہیں۔ ان میں ایک نام سلمٰی اعوان کا ہے، جن کا پہلا سفرنامہ "میرا بلتستان" ہے اور دوسرا سفرنامہ "میرا گلگت و ہنزہ" ہے جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔

سلطانہ ذاکر آدا کا سفرنامہ "سفر کب تک؟" اپنی طرز کا منفرد سفرنامہ ہی نہیں، زندگی کا کارنامہ بھی ہے۔ یہ زندگی کے طویل ترین سفر کے واقعات و مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس سفر کی مدّت ایک اندازہ کے مطابق تقریباً پچاس سال ہوتی ہے (شکریہ جارچوی صاحب، لیکن درحقیقت اس سفر کی مدّت تقریباً ستّر سال ہے۔ سلطانہ آدا، ۲۰۰۲ء)۔ آدا صاحبہ کی تمام زندگی، بالخصوص شادی کے بعد کے تمام ایّام ہندو پاک اور دیگر ممالک کے مختلف شہروں کے درمیان سفر و حضر میں گزرے۔ شاید اسی لئے اس سفرنامے کا نام "سفر کب تک؟" تجویز کیا گیا۔ اب غالباً یہ سفر ابھی بھی جاری ہے اور جب تک زندگی ہے، یہ سفر جاری رہے گا۔

سفر و سیاحت سے متعلق آدا صاحبہ کا طرزِ فکر ان کی فکری رفعت کا غمّاز ہے، اور یہ ان کی کتنی اچھی سوچ ہے کہ جس نے جبری نقلِ مکانی و قیام کو سفر و سیاحت کا رنگ دے کر اپنی تحریری صلاحیت کو نہ صرف منوایا بلکہ اپنی قوم اور ہم وطنوں کو اہم معلومات فراہم کیں۔ آپ کا طویل ترین سفر و قیام سیاحوں کی طرح منصوبہ سازی کے تحتِ ارادی نہیں تھا بلکہ مقام کی تبدیلی کے حکم کے تحت جبری تھا۔ آدا صاحبہ کے اس نظریہ فکر کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ نے بھارت کی مختلف ریاستوں، صوبوں، شہروں، سرحدی و کوہستانی علاقوں، اور تقسیم کے بعد پاکستان کی متعدد سرحدی و کوہستانی آبادیوں کے علاوہ شہروں میں تبادلہ اور قیام کے دوران وہ فوائد حاصل کئے جو ایک سیاح سیاحت کے دوران ان علاقوں اور وہاں کے باشندوں کی تاریخ، تہذیب اور تمدّنی ذرائع سے حاصل کرتا ہے اور یہ معلومات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ سلطانہ آدا نے ایسے تمام علاقوں میں زبان کی تبدیلی اور معنیٰ کو بڑے دلچسپ انداز میں حسبِ موقع بیان کیا ہے۔ ریاست رامپور میں قیام کے دوران ضرورت کی اشیاٗ کی خرید و فروخت کے جو طریقے انہوں نے دیکھے اُن کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ خوردنی اشیاٗ کو فروخت کرنے والے گلیوں میں آوازیں لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔ جس عورت کو اُس چیز کی ضرورت ہوتی، وہ اسے آواز دے کر روکتی اور دروازے پر آکر خریداری کر لیتی، یوں بازار جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ایک روز انھوں نے مرغی اور انڈے فروخت کرنے والے کی آواز سنی تو فوراً اسے آواز دی، "اے مرغی والے، ٹھہرو ہمیں انڈے چاہیئں"۔ اس موقعے پر وہ کہتی ہیں، "مجھے فوراً خیال آیا کہ میاں، 'مرغی والے' کہنا تو گالی ہے یہاں پر، جیسے کہ پنجابی میں پنگے لینا"۔

اسی طرح آپ کے بچّے جوان ہوئے اور تعلیم کے دوران اور پھر پیشہ ورانہ وجوہات سے وہ بیرونِ ملک قیام پذیر ہوئے تو آپ کو ان سے ملاقات اور وہاں قیام کے لئے مسلسل یورپ اور امریکہ کے مختلف شہروں کا سفر اور وہاں قیام کرنا پڑا۔ انہوں نے اس دوران کے مغربی ممالک کی تہذیب و تمدّن سے متعلق مشاہدات اس سفر نامہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ شاید یہ سفر ابھی جاری ہے۔ سلطانہ آدا کا یہ سفر نامہ پوری دنیا میں مرّتب کردہ تمام تر سفر ناموں میں اپنی طرز کا منفرد سفر نامہ ہے۔ اس کی یہ حیرت انگیز انفرادیت اس کی سفری اجتماعیت کے سبب ہے جو کسی سفر نامہ میں نہیں پائی جاتی اور ایسی ہی انفرادیت سلطانہ آدا کی تحریر میں ہے جو کسی مرد یا عورت سیاح کے سفر نامہ میں موجود نہیں۔ اس لئے سلطانہ آدا کو تمام عالمی سیاحوں میں منفرد سیاح کا

درجہ دیا جا سکتا ہے۔ان کی یہ انفرادیت دراصل ان کے جبری اسفار کے مجموعہ کی وحدت ہے اور یہ انہی کا واحد طرزِ فکر ہے۔آداؔ صاحبہ نے اپنے تمام سفروں کو ایک ہی جِلد میں جمع کر دیا ہے۔اسی لئے ان کے سفرناموں میں مسافرت کی ترتیب سے زیادہ داستانی رنگ ہے، جو کہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ انہوں نے تقریباً نصف صدی کو ایک طویل سفر میں پیش کیا ہے۔

۔سرکار زینی جارچوی

۱۸۸۱ء سے ۱۹۹۹ء تک

تبصرہ از محترمہ زاہدہ حنا

محترمہ سلطانہ ذاکر آدا ہماری ان خواتین میں سے ہیں جنہیں قلم اور ادب سے عشق ہے۔ پاکستان میں تھیں تو شعر اور نثر، دونوں میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ اب امریکہ میں ہیں تو بھی نہ کاغذ ہاتھ سے چھوٹا اور نہ قلم سے رشتہ ٹوٹا۔ پاکستان کا پھیرا لگاتی ہیں اور تحفہ میں کسی کتاب کا مسوّدہ لے آتی ہیں۔ اس مرتبہ انہوں نے "سفر کب تک" کا ڈول ڈالا ہے۔ کہنے کو تو یہ سفر کی یادداشتیں ہیں، لیکن سچ پوچھیئے تو یہ سفرِ زندگی کا قصّہ ہے جو ریاست رامپور سے شروع ہوا اور چشمِ بدُور، اب تک آن بان سے جاری ہے۔

رامپور کے نام سے بہت سی خوش گوار یادیں وابستہ ہیں، حالانکہ میں نے وہاں کبھی قدم نہیں رکھا۔ ۱۹۷۶ء میں جب ہمارے عرشی چچا (رامپور رضا لائبریری سے متعلق) کو معلوم ہوا کہ میں رامپور کے قریب سے گزری ہوں لیکن ان کی قدم بوسی کے لئے نہیں آئی تو انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے کیا۔ میرے والد نے بارہ برس ریاست رامپور میں بسر کئے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ایسے جید عالم، عندلیب شادانی ایسے شاعر، شرافت علی خاں، ولی اللہ خاں اور عبدالواحد خاں (رضا لائبریری) ایسے ادب نواز اور علم دوست حضرات سے آخری سانس تک ان کا دوستانہ رہا۔ برادرم ذاکر علی خاں جو ایک نامدار اہلِ قلم ہیں اور سرسّید انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی کے بانیوں میں سے ہیں، وہ میرے والد کی گودوں کے کھلائے ہوئے

ہیں، اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، کی نئی زندگی میں کردار ادا کرنے والے ڈاکٹر عابد رضا بیدار میرے بہنوئی ہیں۔

"سفر کب تک؟" پڑھنا شروع کیا تو رامپور کے ذکر نے ہر صفحے پر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اور رامپور ہی کیا، سلطانہ صاحبہ زندگی کے جن ادوار میں جن مراحل سے گزریں، انہوں نے سبھی کا سادگی اور صفائی سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح شہروں اور لوگوں کے بیان میں بھی ایک سلامت اور نفاست ہے۔

سلطانہ صاحبہ عورتوں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو زنان خانے سے باہر قدم نکالنے کا تصوّر نہیں رکھتی تھی۔ اگر کبھی کہیں جانا ہوا تو ڈولیوں اور پالکیوں میں چار کہاروں کے کاندھے پر سفر کرتی تھی۔ لیکن زمانہ اس تیزی سے بدلا کہ زنان خانے میں زندگی گزر کرنے والی سلطانہ صاحبہ اب برِّ اعظم ایشیا سے امریکہ کا سفر کرتی ہیں اور واقعات لکھتی ہیں۔ ۱۹۳۴ء/۱۹۳۵ء میں اپنے پہلے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں .....

> "ہم شادی میں رتھ پر اپنی والدہ کے ساتھ گئے..... ناگوری بیلوں کی پیٹھ پر سُرخ کپڑے پڑے ہوئے اور اُن کپڑوں پر کوڑیوں کا کام بنا ہوا۔ بیلوں کے گلے میں گھنگروؤں کے ہار پڑے ہوئے، آنکھوں پر سفید جھالر لٹکی ہوئی، جھوم جھوم کے چلتے ہوئے بیل اور ہلِ ہلِ کر سفر کرتے ہوئے ہم لوگ اور رتھ کے اوپر منڈھے ہوئے سُرخ اور ہرے رنگ کے کپڑے، بُرج نما گول سے اٹھے ہوئے۔ گرمی بھی غضب کی ہو رہی تھی۔ اس پر طُرہ یہ کہ چار سال کی لڑکی بھی پردے کی پابند۔ ذرا سی جھری کر کے باہر جھانک نہیں سکتے کہ مرد حضرات ساتھ ساتھ دوسرے رتھوں پر چلے جا رہے ہیں، کسی کی نظر نہ پڑ جائے، ہمارے ابّا نہ دیکھ لیں....."

کہاں چار برس کی وہ سلطانہ کہ رتھ پر سوار ہو کر شادی میں گئی تھیں اور اسے چادروں کی جھری سے جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی اور کہاں سلطانہ صاحبہ کہ لندن، فرینکفرٹ، دمشق، اور جدّہ کو جاتی ہیں، سانتا باربرا اور سان فرانسسکو کی سیر کرتی ہیں اور لاس ویگاس جا کر دنیا کے سب سے بڑے جوئے خانے کو بھی برائے حیرت وعبرت دیکھ کر آتی ہیں۔

زمانہ واقعی منقلب ہو چکا، زنان خانوں میں رہنے والیاں زقندیں لگا کر کہاں کہاں نہ پہنچیں اور ان میں سے جنھوں نے قلم ہاتھ میں لیا، انھوں نے اپنے نت نئے تجربات خوب خوب لکھے۔ اس مرحلے پر ان خواتین کو ضرور یاد کرنا چاہئے جنھوں نے اُنیسویں صدی میں تعلیم حاصل کی اور تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ یوں تو ہمارے یہاں شہزادی گلبدن بیگم، شہزادی زیب النسا مخفی، مہ لقا، چندا بائی اور دوسری متعدد شاعرات کا ذکر ملتا ہے، لیکن نثر کا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ یہ اوّلیت صوبہ بہار کے حصے میں آئی کہ شمس العلماء نواب امداد امام اثر کی خواہر گرامی محترمہ رشید النسا نے ۱۸۸۱ء میں ناول "اصلاحِ النسا" تصنیف کیا جو ۱۸۹۴ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ کسی خاتون کا لکھا ہوا پہلا اردو ناول تھا۔

۱۸۸۱ء سے ۱۹۹۹ء تک برِصغیر کی پڑھی لکھی خواتین نے ایک بہت طویل سفر کیا ہے اور اس سفر کے دوران بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ ان لکھنے والیوں سے اردو ادب کی تاریخ سجی ہوئی ہے، اور اسی میں سے ایک نام سلطانہ ذاکر آدا کا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے رنگ اور اپنے اور اپنے ان گنت اسفار کے ڈھنگ بہت خوشدلی اور خوبصورتی سے لکھے ہیں۔ بطورِ خاص رامپور میں اپنے بچپن کی یادیں لکھ کر انہوں نے ایک ایسے عہد کو محفوظ کر دیا ہے جس کا تذکرہ کرنے والے اب خال خال نظر آتے ہیں۔

۔ زاہدہ حنا

سلطانہ ذاکر آدا اور سفر نگاری

تبصرہ از نقاش کاظمی

سفر نامہ اب اہلِ قلم کا ایک وصف بن چکا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں سفر نامہ یا سفر نگاری نے ادب میں ایک صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بعض لکھنے والوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے طفیل اس صنف یا اس فن میں بے انتہا ترقی کر لی ہے۔ ہمارے اردو اہلِ قدم میں رضا علی عابدی، مستنصر حسین تارڑ، قمر علی عباسی، اے حمید اور کئی دیگر لکھنے والوں نے بڑے دلچسپ اور عمدہ سفر نامے تحریر کئے ہیں جو اب کتابی شکل میں آ چکے ہیں۔ یوں تو محمود شام، ڈاکٹر حسن رضوی اور انوار احمد ذکی نے بھی ایک ایک سفر نامہ لکھا جو شائع بھی ہوئے، لیکن خواتین میں سفر لکھنے والوں میں چند ہی نام ہیں اور جن میں اب سلطانہ ذاکر آدا کا نام بھی شامل کیا جائے گا۔

سلطانہ ذاکر آدا سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۹۳ء میں سان فرانسسکو کے قریب واقع یو۔سی۔ برکلے آڈیٹوریم میں ایک مشاعرہ کے دوران ہوئی تھی۔ بعد میں پاکستان میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پہلے تو انھوں نے اپنے شعری معاملات سے ہمیں آگاہ کیا اور انھوں نے تین کتابیں شائع کیں۔ پہلی کتاب ''معراجِ وفا'' کا مقدمہ لکھنے کی ذمّہ داری ہمیں سونپی۔ رثائی ادب کے حوالے سے بھی مجموعے شائع ہوئے۔ اور اب انھوں نے ہمیں اپنے نثری سرمائے سے سفر کے معاملات، واقعات اور داستانیں سنائیں

جو اس سفر نامے کی صورت میں موجود ہے۔

ابتداء میں سفر نگاری ایک ریپورتاژ کی صورت میں سامنے آتی رہی، پھر رفتہ رفتہ کتابی شکل میں سامنے آنے لگی۔ اردو کے بعض سفر نامے اب کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ جو اہلِ قلم اس وقت سفر نامے تحریر کر رہے ہیں ان کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے یہاں تاریخی حوالے ملتے ہیں، کسی نے جغرافیائی معاملات کو زینتِ تحریر کیا۔ کسی نے سیاسی موشگافیاں کیں اور کسی نے محض زباں دانی اور چٹخارے دار مسالہ فراہم کیا ہے۔ لیکن سلطانہ ذاکر آدا نے ہلکے پھلکے انداز میں سفر کی کہانی بیان کی ہے جس کا آغاز بھارت کے شہر رامپور سے ہوتا ہے جہاں انھوں نے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔

سلطانہ صاحبہ کے سفر نامے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ماحول پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ اپنے خاندان، اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب کو انھوں نے جتنے قریب سے دیکھا، اس سے کہیں زیادہ قربت سے لکھا ہے۔ شاعری کے مطالعے کے بعد سلطان صاحبہ کی نثر پڑھ کر لطف ملتا ہے اور خاص کر جن لوگوں نے ان سفری مقامات کا مطالعہ کیا ہے اور ان مقامات پر جا چکے ہیں، انہیں سلطانہ صاحبہ کی تحریر اور زیادہ متاثر کرتی ہے۔ ہندوستان، پاکستان، سعودی عرب، امریکہ اور دیگر ممالک، اور پھر ملک کے اندرونی سفر کے واقعات جس دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں، وہ انہی کا خاصہ ہے۔ انھوں نے ہر واقعے کو مختصر تحریر کیا اور کسی بھی مسئلے کو بلا وجہ طولانی نہیں کیا۔ اس طرح پڑھنے والا بہت تیزی سے ان کی تحریروں کے سہارے خود بھی سفر میں مشغول ہو جاتا ہے اور سلطانہ ذاکر آدا کے بیان کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ انھوں نے بہت ہی پُر اثر انداز میں تمام واقعات، کردار، وقت اور حالات کو اپنی تحریروں میں سمیٹا ہے۔

امید ہے قارئین سلطانہ ذاکر آدا کے سفر نامے کو پسند کریں گے اور دوسروں تک بھی مطالعے سے آگاہ کریں گے۔

۔ نقاش کاظمی

سلطانہ آؔدا اور ''لمحۂ موجود''

تبصرہ از ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ قائدِ اعظم اکادمی، کراچی

میں نے سلطانہ ذاکر آؔدا صاحبہ کی یادداشتوں کا مجموعہ ''سفر کب تک؟'' بہت دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھا اور ورطۂ حیرت میں پڑ گیا۔ آؔدا صاحبہ کا اسلوبِ نگارش سادہ، سلیس، پُرکشش اور پُرتاثیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے آؔدا صاحبہ کی یادداشتوں میں وادیٔ گنگ وجمن کی زبان کا قابلِ رشک اسلوب پایا۔ مجھے یقین ہے کہ اردو میں شاید ہی کسی اور مصنفہ نے یادداشتوں کے سہارے اپنے مشاہدات کو اس خوبی کے ساتھ رقم کیا ہو۔ رامپور اور امروہہ کی ثقافتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں اور جو کچھ گزر چکا ہے وہ ضبطِ تحریر میں آ کر گزر چکنے اور معدوم ہو جانے سے بچ گیا ہے۔

میں نے روہیل کھنڈ کی زندگی پر بعض خواتین کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن ان تحریروں میں ''لمحۂ موجود'' کا رنگ چھایا ہوا ملتا ہے۔ آؔدا صاحبہ ماضیٔ قریب کی زبان پر پوری طرح قادر ہیں اور انہوں نے زبان کے ''جوہرِ خاص'' کی پوری طرح حفاظت کی ہے۔ آؔدا صاحبہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ ان کی شاعری کی زبان و بیان بھی لائقِ توجہ ہے اور اس طرح نثری زبان کی خوبیوں کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اچھے شاعر اچھے نثر نگار بھی ہوں۔ آؔدا صاحبہ کی یادداشتیں ایک دور کی ثقافتی زندگی کی مرقع نگاری کے علاوہ منافقت سے پاک ماحول کے خاتمہ پر نوحہ کا درجہ رکھتی ہے۔

۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی